ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.4,Issue No.2(2022)
(July to December)

عبداللہ حسین کی ناول نگاری میں طبقاتی شعور

Class consciousness in Abdullah Hussain's novel writing

ڈاکٹر شکیلہ جبیں
لیکچرار، شعبہ اُردو، پنجاب گروپ آف کالجز، فیصل آباد کیمپس

Abstract

Abdullah Hussain won a very prominent position as a writer. He still would have a special importance if he had written mere ' Udas Naslen '. He belonged to a middle class family but he did not adopt an adorable attitude in mirrored all three clasess to a great extent,comprehended their problems and as depicted their role in life and socity as he observed.He has presented the bourgeoise among the elites in a balanced way. He has depicted the conflict and rise and fall among the classes in his best way presenting them in materialistic (worldly) form.

Key words : Adullah Hussain,class-conflict,Roshan Agha, Bagh, observed, materialistic

عبداللہ حسین اُردو ادب میں ایک نمایاں حیثیت کے حامل ادیب ہیں۔ عبداللہ حسین اگر صرف "اُداس نسلیں" ہی لکھتے تو بھی ان کی اہمیت مسلم ہوتی کیونکہ یہی ناول آج تک عبداللہ حسین کی پہچان ہے۔ عبداللہ حسین کا نام آتے ہی "اُداس نسلیں" خود بخود ذہن میں آجاتا ہے۔ اور "اُداس نسلیں" کا تذکرہ کرتے ہی عبداللہ حسین کا تصور قائم ہو جاتا ہے۔ ہر ادیب اپنے ماحول اور تخلیقی مواد سے مدد لے کر اپنا سفر طے کرتا ہے۔ معاشرے کے تمام اچھے برے پھل ادیب کی جھولی میں گرتے ہیں جن سے وہ اپنی استطاعت کے مطابق تقویت حاصل کرتا ہے۔ اس سارے عمل میں مصنف کی معاشرتی حیثیت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ عبداللہ حسین نے پنجاب کے کلچر میں آنکھ کھولی اور اسکی گود میں زندگی کی منازل طے کیں لہذا ان کی تحریروں میں یہ بار بار ابھرتا ہے عبداللہ حسین نے اپنے ارد گرد پھیلے معاشرے سے جو کچھ حاصل کیا اور جو کچھ سمجھا وہ اپنی تحریروں میں بیان کر دیا ہے۔ زندگی اور معاشرے میں پھیلے مختلف کرداروں کو جس انداز میں بکھرے دیکھا ویسا ہی پیش کیا ہے۔

عبداللہ حسین کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ مگر اپنے طبقے کی نمائندگی میں عبداللہ حسین نے کوئی ستائشی رویہ اختیار نہیں کیا ۔عبداللہ حسین نے مختلف طبقات کو نمایاں حیثیت دی ہے۔ ان طبقات کے مسائل کو انتہائی گہرائی سے پرکھا ہے اور زندگی اور

معاشرے میں ان کے کردار کو جیسا دیکھا ویسا ہی بیان کر دیا ہے۔ البتہ متوسط طبقے کو دونوں اعلیٰ و نچلے طبقے کے درمیان توازن کی شکل میں پیش کیا ہے۔

"اُداس نسلیں" کا عہد ۱۸۵۷ء سے قبل سے ۱۹۴۷ء تک محیط ہے۔ اس ناول میں بہت سے کردار ہیں جن میں روشن آغا ، نعیم، نیاز بیگ، پرویز، عذرا، نجمی، علی اور مہندر سنگھ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ روشن آغا طبقۂ اشراف سے ہیں اور ان کے بچے اس عہد کی تمام تر ترقی کے حامل کردار ہیں۔ نعیم نیاز بیگ کا بیٹا ہے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہیں۔ نعیم اپنے طبقے سے اعلیٰ طبقے تک کا سفر طے کرتا ہے، اور پھر اپنے طبقے کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اندر موجود متوسط طبقے کی حساسیت کو ختم نہیں کر پاتا ۔ کہانی تمام تر سفر نعیم کے کردار کے ساتھ طے کرتی ہے۔ علی جو نعیم کا چھوٹا بھائی ہے، نچلے طبقے کے نمائندہ کردار کے طور پر ابھرتا ہے ۔ اس ناول میں طبقات پر جم کر نہیں لکھا گیا تاہم مختلف طبقات کی عکاسی ضرور ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر طبقات کو پیش کرنا اس ناول کا مقصد نہیں ہے۔ یہ ناول ایک عہد کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ جس میں طبقات کی بنتی ابھرتی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ روشن آغا کو ایک انگریز کرنل جانسن کی جان بچانے کے صلے میں ایک اراضی انعام میں دی گئی۔ جس نے روشن علی خان کو جاگیر دار بنا دیا۔ اس سے پہلے روشن علی خان برطانوی دورِ حکومت میں ضلع رہتک کے کلکٹر کے دفتر مین ایک معمولی اہل کار تھے لیکن پھر قسمت ان پر مہربان ہو گئی، روشن علی خان کی زندگی بدلنے والا یہ واقعہ بھی تفصیل کے ساتھ اس ناول میں موجود ہے۔

> "اپنی گلی سے پچھلی گلی کے اندر داخل ہوئے تھے کہ چند قدم آگے ایک بھاگتے ہوئے شخص پر نظر پڑی۔ دیکھتے دیکھتے وہ سایہ لڑکھڑا کر گرا اور ساکن ہو گیا" روشن علی خان اس زخمی کو اُٹھا کر گھر لے آتے ہیں اور "گھر پہنچ کر جو چراغ کی روشنی میں دیکھا تو یکلخت سرد پڑ گئے۔ ان کے سامنے سنہری بالوں والا انگریز پڑا تھا، جو ہندوستانی دکانداروں کے لباس تھا "(۱)

روشن علی خان نہ صرف اس سپاہی کو بچاتے ہیں بلکہ خفیہ طور پر اس کا علاج بھی کرواتے ہیں۔ برطانوی حکومت کے زیر تسلط ہندوستان میں کسی بھی جگہ گھوڑے پر بیٹھ کر جتنی زمین کا چکر لگا لے، وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی۔ انھوں نے پانچ سو مربعوں پر مشتمل زمین کو اپنی ملکیت میں لیا اور انگریز سرکار سے آغا کا لقب حاصل کیا۔ اس رقبے کو جو روشن علی خان کو حاصل ہوا روشن پور کا نام دیا گیا۔ روشن پور روشن علی خان کی اولاد کو ورثے میں ملتا ہے۔ روشن آغا ہر وہ انسان ہے جو اس جاگیر کا مالک بنتا ہے۔ روشن آغا کے محل کی تقریبات میں ملک کے بڑے بڑے جاگیر دار (ہندو مسلم) اور انگریز حاکموں میں سے صاحبِ حیثیت اور باوقار عہدوں کے مالک لوگ شریک ہوتے ہیں، انگریزوں اور ہندوستانیوں میں کلاس کا فرق نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے۔ روشن محل کی تقریب میں انگریز ایک نمایاں حیثیت میں بیٹھتے ہیں اور ہندوستانی الگ بیٹھتے ہیں۔ صرف مہاراج کمار پرتاب گڑھ انگریزوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں جو خود بھی انگریزی لباس میں تھے۔ یعنی صرف انہیں انگریز کی برابری حاصل تھی۔ انھوں نے یہاں سرسری طور پر نچلے طبقے کا تذکرہ کیا ہے، مگر جملہ معنی خیز بھی ہے اور برعظیم کی طبقاتی روایت کا اشاریہ بھی ہے۔

> "نچلے طبقے کے چند لوگ ابھی تک شور مچا کر روانہ ہوتی موٹر کاروں کو دیکھنے کے لیے باہر کھڑے تھے) " (۲)

نچلے طبقے کے لیے یہ گاڑیاں اور موٹریں عجوبۂ روزگار تھیں ہر وہ نئی چیز جو انہیں حاصل نہ تھی، اس کو دیکھنے کا اشتیاق اس طبقے میں موجود ہوتا ہے۔ جس کی مختصر مگر جامع تصویر یہاں کھینچی گئی ہے، یہاں وہ حسرت نمایاں ہوتی ہے جو اس طبقے کی محرومی اور یاس کی عکاسی کرتی ہے۔ زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم یہ طبقہ اعلیٰ طبقے کی یہ فراوانی حسرت سے دیکھتا ہے۔ نعیم اپنے چچا (ایاز بیگ) کے ساتھ روشن محل کی تقریب جو نواب محی الدین کی اپنے باپ مرزا ایاز بیگ کی وفات کے بعد خاندان کے سربراہ کی تاج پوشی کے سلسلے میں منعقد کی گئی میں شریک ہوا تھا۔ یہاں نعیم کی ملاقات محی الدین کی بیٹی عذرا سے ہوتی ہے اور عذرا سے کسی حد تک متاثر بھی ہوا تھا، اس نے اتنی آزاد اور اتنی فراخ لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں، کیونکہ اس کے اپنے طبقے میں ایسی لڑکیاں تھیں ہی نہیں۔ وہ جب روشن محل دوبارہ جانا چاہتا ہے تو ایاز بیگ سخت برہم ہوتا ہے اور وہ نعیم کو اپنی حیثیت اور حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

"نہیں اب پتہ چل جانا چاہیے۔ اب تم بچے نہیں ہو، گاؤں میں ہمارا واحد گھر ایسا تھا جو روشن پور کی جاگیر کا مزارع نہیں تھا۔ ہمارا باپ جاگیر دار کے گھر جا کر کرسی پر بیٹھتا تھا۔ ایسا ہم نے سنا تھا۔ وہ دلیر اور محنتی شخص تھا۔ (۳)

نعیم کا کردار اس طبقاتی کشمکش کو سمجھنے میں اہم کردار کرتا ہے۔ یہ کردار بیک وقت دو دنیاؤں کا باسی ہے۔ عذرا کا کردار ناول کا دوسرا اہم کردار ہے۔ لیکن یہ کردار نعیم کے کردار تلے دبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نعیم سے شادی کے بعد ہمیں عذرا کا کردار کچھ وضاحت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے لیکن جلد ہی وہ پھر سے پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ عذرا ایک جاگیر دار گھرانے کی چشم و چراغ ہے جس کی تمام تر جاہ و حشمت برطانوی حکومت ہی کی دین ہے۔ وہ اعلیٰ انگریزی سکولوں کی تعلیم یافتہ ہے نہایت ناز و نعم میں پلی بڑھی ہے۔ وہ اشرافیہ کے طبقے کی نمائندہ ہے۔ ساتھ ساتھ نعیم سے بھی محبت کرتی ہے۔ یہاں اس میں تضادات کا ظہور ہوتا ہے۔ نعیم سے شادی کا فیصلہ جذباتی فیصلہ تھا اور ایسا ہی کچھ جذباتی فیصلہ اس نے اپنے طبقے سے بغاوت کے وقت بھی کیا۔ ڈاکٹر محمد افضال بٹ ناول کے اس اہم نسوانی کردار پر بات کرتے ہیں:

"اس کا کردار طبقاتی بغاوت کی نمائندگی کرتا ہے جو سماج کی طبقاتی تفریق سے ٹکر لینے کی ہمت رکھتی ہے۔ (۴)

دیہاتی زندگی میں زمیندار اور کسان کے درمیان آقا اور غلام کا رشتہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ اور نچلے طبقہ میں تقسیم۔ وہ لوگ جو اپنی زمین پر خود کھتی باڑی کرتے ہیں دیہات کی زندگی میں متوسط طبقے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات کی صراحت پورے ناول میں موجود ہے۔ ناول میں دوسری جنگ عظیم کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ انگریزوں کی اس جنگ میں برعظیم سے ایندھن (پنجاب سے لوگوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کیا گیا) فراہم کیا گیا۔ روشن پور گاؤں سے زبردستی لوگوں کو جنگ پر بھیجا گیا۔ نعیم اور مہندر بھی اس جنگ پر جاتے ہیں۔

"پر ہم یہاں کیوں ہیں۔ "ہم" کس لیے آئے؟ "جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں۔ اور انگریز ہمارے مالک ہیں بس "" ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔ میاں اتنا جانتا ہوں " " انگریز روشن آغا کے مالک ہیں، چنانچہ (۵)

مالک کے لیے لڑنا بھی ایک طبقاتی جبر ہے، جس سے مہندر سنگھ اور ایسے بہت سے لوگ گزر رہے ہیں۔ روشن آغا کی حیثیت مالک کی ہے اور دیہات کے کسان مجبور ہیں کہ وہ اپنے مالک کا حکم مانیں۔ روشن آغا کے موٹر خریدنے پر "موٹرانہ" کی ادائیگی نعیم کے لیے ایک عجیب اور تکلیف دہ شے تھی۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر ہے کہ آخر روشن آغا کی موٹر کی قیمت کسان کیوں ادا کرے؟۔ وہ اس ناانصافی کا جواز نہیں تلاش کر پا رہا تھا۔ نعیم نے اپنے باپ نیاز بیگ سے بھی پوچھا کہ کیا وہ موٹرانہ دیتا ہے تو اس کا باپ جواب دیتا ہے:

"ہماری تو اپنی زمین ہے ہم کیوں دیں گے" اسکے باپ نے چھاتی پھلا کر کہا۔ "ہمارے نزدیک آنے کی ان کی ہمت ہے؟ سب کو سلا دوں۔ ہم نے کر اس جیتا ہے، یہ کوئی مذاق ہے(۶)

گویا روشن آغا نچلے طبقے کے ہر عمل پر پوری رسائی رکھتا ہے۔ جہاں تک کر اس جیتنے کی بات ہے تو انگریز سرکار کی دی ہوئی خیرات قابلِ ستائش ہے انگریزوں نے اس طرح کی نوازشوں سے ایک طرف جاگیر درانہ نظام کو مضبوط کیا دوسری طرف اپنی ہی ضرورت کے تحت ایک ایسا طبقہ تیار کیا، جس کی موجودگی میں جاگیر دار طبقہ مسلسل خوف کا شکار رہے۔ اس طرح انگریز کی حکومت مضبوط ہوتی رہے گی۔ لوگ انگریز سرکار کے مرہونِ احسان رہیں گے۔

یعنی سرکار کا منظورِ نظر معاشرے میں عزت سے سر اُٹھا کر چل سکتا ہے۔ زمانے کا مزاج اس حد تک بدل چکا ہے کہ انسان نہیں انسان کی معاشی حالت ہی اسے قابلِ احترام یا قابلِ مزمت بناتی تھی۔ یہ طبقاتی فرق انسانیت کی تذلیل محسوس ہوتی ہے۔ بلخصوص نچلا طبقہ نسل در نسل جاگیر دارانہ استحصال کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ ان کے دکھ، ان کی تکلیف کا احساس کسی کو نہیں ہوتا۔ یہ اپنی زندگی کا آغاز ہی مقروض کی حیثیت سے کرتے ہیں، اور مقروض ہی سے مر جاتے ہیں۔ انسانیت تو کیا حیوانیت کے درجے سے بھی نچلی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ برعظیم میں اچھوت کی زندگی کی بے سروسامانی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی اس سماج میں آریہ کی تہذیب پرانی ہے۔ عبداللہ حسین نے سماج کے سب سے نچلے طبقے کو نظر انداز نہیں کیا۔ نچلا طبقہ جو زندگی کے لوازمات سے محروم ہے اس کی تکلیف کا احساس کسی کو نہیں ہے۔ مدن کے کردار کے ذریعے عبداللہ حسین نے اس طبقے کی محرومی اور تکلیف کو پیش کیا ہے۔

"ٹھیرو ٹھیرو" مدن نے بیتابی سے بات کاٹی۔ "زیادہ باتیں نہ کرو۔ سنو میں گاؤں کا اچھوت تھا۔ مجھے کس طرح وہاں سے نکلنا پڑا۔۔۔۔ تمہیں سب پتہ ہے؟ میں زمیندار کے کتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا اور رہتا سہتا تھا۔ پھر میں کئی سال تک ملک بھر میں دھکے کھاتا رہا۔۔۔ اور میں نے ایک روز پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ تمہیں پتہ ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اور تم احساسِ جرم کی بات کرتے ہو۔ تم نے دو سال کی جنگ دیکھی ہے اور ڈینگ مارتے ہو۔ میں نے ایک ایک دن دیکھا ہے اور پچیس برس نکل گئے ہیں۔ میرے پاس یاد رکھنے کو بہت کچھ ہے اور وہ میری بہن جو میرے بعد فاحشہ عورت بنے گی۔ اس لیے جیل جانا پسند نہیں کرتا(۷)

یہاں طبقاتی تفریق کے ساتھ طبقاتی کشمکش کا احساس بھی ہوتا ہے اور نچلے طبقے کے افراد کا ذہنی کرب اور خوف بھی نمایاں ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسان کو بغاوت پر آمادہ کرتی ہیں جیسا کہ مدن کے باب میں ہوا۔ برعظیم میں ذات پات کے نظام کی جڑیں مضبوط رہیں۔ لوگوں کو اپنے حقوق کا زیادہ شعور نہیں ہے، گویا یہ سرزمین غلامی کے لیے زرخیز رہی ہے، مقامی جاگیر داروں، زمینداروں کے ساتھ

ساتھ غیر ملکی آقاؤں کو بھی بڑی آسانی سے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اعلی طبقے کی اپنی تہذیب ہے۔ نعیم کو پذیرائی نئی نسل میں حاصل ہوئی یا انگریز سرکار سے، مگر تاجروں اور جاگیر داروں اور سیاسی لیڈروں کے لیے وہ قابلِ اعتنانہ تھا۔ مگر طبقاتی اختلاف کے باوجود اپنے لیے واضح مقام حاصل کر لیا تھا۔ جس کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ اس کا اظہار روشن آغا کے الفاظ سے بھی ہوتا ہے۔

"ہم لوگ ایک ہی نسل کے آدمی تھے۔ نیاز بیگ اور ہم سب۔ اب تم لوگوں کو چاہیے کہ ہم سے ملا کرو۔ نئی نسل کچھ بے مروت واقع ہوئی ہے۔" وہ اُداسی سے ہنسے اور گزر گئے"۔(۸)

یہ تمام تفصیل عبداللہ حسین کی عمیق نظر اور گہرے طبقاتی شعور کا پتہ دیتی ہے۔ عبداللہ حسین نے انگریز سرکار کی پالیسی کے تحت معاشرے میں پھیلتے ہوئے پیچ دار طبقات کو جزیئات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں نچلے طبقے کا نمائندہ کردار ناول میں علی کے کردار کے ذریعے بیان کیا گیا ہے جو نعیم کا سوتیلا بھائی ہے، جسے نعیم نے دیہات سے نکال کر شہر کی طرف دھکیل دیا تھا مناسب تربیت اور تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے علی کو ایک مزدور کی حیثیت سے مل میں کام کرنا شروع کر دیا اور زندگی کو پست اور نچلی سطح پر بسر کرتا ہے

" باگھ" عبداللہ حسین کا دوسرا ناول ہے۔ جو ایک علامت ہے خوف کی۔ خوف جو انسان کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا ہے ، کبھی انسان اس پر قابو پالیتا ہے اور کبھی انسان اس کے ہاتھون زندگی کی ہر اُمید چھوڑ دیتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اسد ہے جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور بچپن سے اپنے اندر خوف کو محسوس کرتا ہے ہار جانے کا خوف ڈوب جانے کا خوف، مجرم ثابت ہونے کا خوف، موت کا خوف اور یاسمین کو کھو دینے کا خوف، خوف کی یہ خوبی ہے کہ حد سے بڑھتا ہے تو ختم ہو جاتا ہے اور جب خوف ختم ہو جاتا ہے تو انسان اپنی زندگی ایک نئے سرے سے شروع کرتا ہے۔ ناول کے دوسرے کرداروں کو بھی خوف کے زیرِ اثر دکھایا گیا ہے یاسمین کو گمشد کے لوگوں کو، کہ ان کے علاقے میں باگھ آگیا ہے اور وہ سب کسی نہ کسی طرح اسے مار دینا چاہتے ہیں۔ ناول میں باگھ مارشل لاء کی علامت بھی ہے۔ مخصوص نوعیت کی ڈکٹیٹر شپ بطور استحصالی طبقہ۔

اسد سانس کے مرض میں مبتلا ہے۔ اور گمشد میں حکیم محمد عمر سے اپنا علاج کرا رہا ہے، حکیم کے پاس اور بھی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کی دوائیاں کوٹتے اور پیستے ہیں۔ اسد بھی دوا کی بوٹی پیستا ہے۔ حکیم باری باری سب کی دوائی چیک کرتا ہے اور نئی ہدایات جاری کر دیتا ہے۔ حکیم ایک متمول انسان ہے گمشد میں عرصہ سے رہ رہا ہے۔ اس کے بارے میں مختلف لوگ اپنی اپنی رائے رکھتے ہیں ۔ یہاں حکیم کا کردار بطور آقا (اعلیٰ طبقہ) کے اُبھرتا ہے اور اس کے پاس کام کرنے والے لوگ بطور غلام (نچلا طبقہ) اپنی شناخت کراتے ہیں نفرت ہمیشہ نیچے سے اُوپر کی طرف سفر کرتی ہے۔ میر حسن بھی ایسا ہی کردار ہے جو اپنی شناخت نچلے طبقے کے فرد کے طور پر کراتا ہے اور حکیم جو اس کے لیے اعلیٰ طبقے کا نمائندہ ہے، سے نفرت کرتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ ہمیشہ نچلے طبقے کا استحصال کرتا ہے اور اس کی محنت کا پھل کھاتا ہے۔ حکیم اپنے مطب میں میر حسن جیسے لوگوں کی محنت حاصل کرتا ہے۔ جس طرح زمیندار کچھ اناج کے عوض کسان (کھیت مزدور) کی محنت حاصل کرتا ہے۔ معاشرے میں چھوٹے بڑے مختلف النوعیت طبقات موجود ہیں۔ حکیم اور اس کا مطب

اسی نوع کی طبقاتی تقسیم کو پیش کرتے ہیں اور جہاں میر حسن اور اسد جیسے لوگ موجود ہیں۔ عبداللہ حسین نے حکیم کے مطب کے ذریعے طبقات کی ایک اور شکل کو پیش کیا ہے۔ اسد ساری صورتحال سے تنگ آ کر اور کم افاقے کی بنا پر گمشد چھوڑ کر چلا جاتا ہے مگر اس کا سانس پھر خراب ہو جاتا ہے اور سوائے واپسی کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حکیم اعلیٰ طبقے کی رعونت کا اظہار کرتا ہے۔ دہقان گمشد کے غریب کسان جو محنت مزدوری کر کے اپنی زندگی بسر کرتے تھے، اور جن کی محنت پر بالائی طبقے پلتے تھے، توجہ اور میل جول کے قابل نہیں تھے جاگیر داری نظام ختم ہو چکا تھا مگر جاگیر دارانہ ذہنیت ختم نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ جاگیر داری نے سرمایہ داری سے ہاتھ ملا لیا تھا اور معاشرے میں نیا استحصالی اعلیٰ طبقہ وجود میں آ گیا تھا۔ طبقات کے حوالے سے عبداللہ حسین ایک الگ سوچ کے حامل ہیں۔ اس اقتباس سے انہوں نے اعلیٰ طبقے کے کشادہ گھروں کی تنگ دلی اور متوسط طبقے کے محدود گھروں کی کشادہ دلی کو ظاہر کیا ہے ۔"متوسط آمدنی والا گھر تھا مگر وہاں پہ چیزوں کی چھوٹ تھی"۔ یہ جملہ معنی خیز ہے۔ فی زمانہ عام طور پر یہ خیال اٹوٹ ہو گیا ہے کہ انسان کے پاس جتنی دولت آتی ہے وہ اتنا ہی خصیص ہوتا جاتا ہے۔ دولت کی فراوانی انسان سے انسانیت چھین لیتی ہے۔ ناول قید ایک منفرد موضوع پر لکھا گیا ہے۔ پاکستان کی سرزمین پیر پرستی کے لیے خاص طور پر زرخیز ہے۔

> "پیر کرامت علی، جنھیں خلقت خدا بابا پیر و مرشد کے نام سے بھی یاد کرتی تھی اپنی بیوی اور بچے کی زبان سے فقط شاہ جی کہلاتے تھے۔۔۔۔ کرامت علی شاہ کے بارے میں ایک غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ کبھی اپنے گھر کے اندر نہیں سوتے تھے۔ کبھی بھولے بھٹکے آنکلتے تو بچے کی ماں کے کمرے میں بیٹھ کر اس سے ایک آدھ گھڑی کوئی بات کر لیتے، ورنہ ہمیشہ حجرے میں رات بسر کرتے، سوائے سال کے ایک دو موقعوں کے جب وہ دورے پر آس پاس کے گاؤں میں اپنے چند ایک بڑے بڑے مریدوں کے ہاں قیام کی غرض سے نکلتے۔ اس دورے کا مقصد مریدوں کو زیارت سے نوازنا تو تھا ہی، اس کے علاوہ نئے متعقدین کو وعظ و نصائح اور بیعت کا موقعہ فراہم کرنا بھی ہوتا تھا۔ دورے کے اختتام پر پیسے کے علاوہ بہت سا چڑھاوے کا مال بھی آتا جس کو لنگر خانے میں داخل کر دیا جاتا۔(۹)

برکت علی درمیانے درجے کا زمیندار تھا جیسے دیہات میں خوشحال گھرانے ہوتے ہیں۔ اس کی کوئی لمبی چوڑی جاگیر نہیں تھی، نہ ہی وہ صاحب اقتدار شخص تھا۔ چوہان قوم سے تعلق رکھنا اس کے لیے باعثِ افتخار تھا مگر غرور کا باعث نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے سے نچلی ذات میں نکاح کیا۔ ایک فقیر کی دعا سے بالآخر برکت علی کے یہاں کرامت علی کی پیدائش ہوئی کرامت علی اپنے باپ کے خواب کی تفسیر تھا اور اس کے نام کی روشنی ہر طرف پھیل گئی۔

> "زمینی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ انسانی سلسلے کا پھلاؤ بھی ناگزیر تھا۔۔۔۔۔ پیر کرامت علی شاہ کا مزاج ان چند برسوں میں بدل چکا تھا۔ اب اس کا انداز ایسا تھا کہ اس نے ان لوازمات کو خاطر میں لانا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ جب پہلی بار رحمت علی اور اس کے بھائیوں نے اس بات کا ذکر کیا کہ کسی مرشد سے اپنی بیعت کے اجراء کی اجازت حاصل کر لینی چاہیے، تو پیر کرامت علی شاہ نے یہ کہہ کر "مرید بھی یہاں اور مرشد بھی یہاں اللہ کی راہوں پر

کوئی رکاوٹ نہیں " بلا تامل اپنا الماس کی انگوٹھی والا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ چوہان برادران نے جب یہ جلال دیکھا تو بلا حجت سر جھکا کر ہاتھ کو چوما اور بیعت کر لی) "(۱۰)

پیر کرامت علی شاہ اعلیٰ طبقے سے بیوروکریٹ طبقے میں داخل ہو گیا اس کے دل میں سیاست میں داخل ہونے کی خواہش بدستور قائم تھی کیونکہ اپنی نوجوانی کے زمانے سے ہی سیاست کا شوق رکھتا تھا۔ کالج میں وہ سٹوڈنٹ یونین کا ممبر بھی رہا تھا۔ کالج میں اس کی دوستی فیروز شاہ سے تھی۔ دونوں ہی ذہین تھے۔ دونوں سیاست سے وابستہ تھے، وقت کے ساتھ ان کی دوستی گہری ہوتی گئی ،اگرچہ کہ فیروز شاہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔

" فیروز شاہ ایک پیش امام کا بیٹا تھا، اپنی معمولی حیثیت کے باوجود فیروز شاہ بھی کرامت علی کی مانند قدرتی اوصاف سے مالا مال تھا۔ سکول کے زمانے سے ہی ان دونوں بچوں کی آپس میں دوستی تھی اور ساتھ ہی ساتھ رقابت کا انداز بھی تھا۔(۱۱)

کالج میں کرامت علی شاہ اور فیروز شاہ کی دوستی اور گہری ہو گئی۔ کالج میں ہی ان کی نظر رضیہ سلطانہ پر پڑی جو بہت مختلف لڑکی تھی، کالج کی سیاست میں سٹوڈنٹ کی سرگرم رکن تھی دونوں رضیہ کو پسند کرتے تھے مگر رضیہ کا جھکاؤ فیروز کی طرف تھا، لہذا کرامت علی دستبردار ہو گیا رضیہ متوسط گھرانے کی لڑکی تھی جس کا والد ایک ریٹائرڈ افسر تھا۔ رضیہ سلطانہ اپنے خاندان کی مختلف اور بہت شوخ لڑکی ہے اس کے اندر پارے کی سی بے چینی بھری ہے۔ فیروز شاہ سے اس کے تعلقات حد سے تجاوز کر جاتے ہیں جب کرامت علی اس سے پوچھتا ہے کہ وہ فیروز شاہ سے شادی کیوں نہیں کر لیتی تو وہ جواب دیتی ہے:

"تم لوگوں کو دنیا بھر کی فکر لگی رہتی ہے۔ عوام عوام کرتے تمہاری باری نہیں آتی ذرا بتاؤ عوام کون لوگ ہوتے ہیں؟۔۔۔۔۔ سنو! ایک بار میں نے فیروز شاہ سے یہ سوال پوچھا تھا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ پھر میں نے دوہرا کر پوچھا تو بولا، غریب لوگ، ریڑھی والا، تانگے والا، رکشا چلانے والا، میں نے پوچھا اور؟ تو بولا سٹیشن والا قلی، ڈاکیہ، بس ڈرائیور پھر میں نے پوچھا اور؟ بولا پھیری لگانے والا، لوہا کوٹنے والا، بجلی کا میٹر پڑھنے والے، کرسیاں بنانے پولیس کے سپاہی، چارپائیاں بننے والے، برتن قلعی کرنے والے، میں نے پوچھا اور تو چڑ گیا۔ بولا کیا اور اور لگا رکھی ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں نے کہا اور عورتیں؟ اس پر وہ کچھ حیران ہوا۔ پھر بولا ہاں عورتیں۔ میں اس وقت ہنس دی۔ بیچارے نے بے خودی میں سچی بات کہہ دی ۔ تمہارے عوام میں ہم لوگ کہاں شامل ہوتی ہیں۔(۱۲)

رضیہ عورتوں کے حقوق کی علمبردار ہے۔ عوام میں عورت شامل نہیں۔ معاشرے میں ہر طبقہ موجود ہے۔ سب عوام ہیں مگر عورت کسی طبقے کا حصہ نہیں اس لیے عوام بھی نہیں۔ دراصل رضیہ سماج کی اس بے انصافی پر طمانچہ ہے۔ وہ فیروز شاہ سے محبت کرتی ہے مگر شادی نہیں کرتی کہ جو عورت کو عوام ہی نہیں سمجھتا وہ عورت کے حقوق کے لیے کیا کام کرے گا۔ قید میں عبداللہ حسین طبقات در طبقات تقسیم شدہ معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ طبقات جو معاشرے کی زیریں سطح پر عمل جاری رکھتے ہیں اور معاشرے کی اوپری سطح پر اپنا اثر ظاہر کرتے چلے جاتے ہیں۔ "قید" میں انہوں نے طبقات کی ایک مختلف شکل کو پیش کی ہے، جو بظاہر دکھائی نہیں دیتی۔

نادار لوگ کا عہد تقسیم 1947ء سے شروع ہوتا ہے۔ نادار لوگ کو "اُداس نسلیں کی توسیع کہا جاتا ہے۔ یہ صرف اس حد تک ہے کہ اُداس نسلیں تقسیم 1947ء پر ختم ہوتا ہے اور "نادار لوگ" شروع ہوتا ہے۔ نادار لوگ میں عبداللہ حسین نے پاکستان کے نئے بنتے بگڑتے معاشرے میں ذات برادری، نسلی امتیازات، مہاجرین کی رہائش کے مسائل کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود اوپری بالائی طبقوں اور نچلے متوسط طبقوں کا احاطہ بھی کیا ہے۔ نیز فوج اور اس کے عمومی رویے کا بھی احاطہ کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اعجاز ہے جو سب سے زیادہ متحرک کردار کہا جاسکتا ہے، کیونکہ مصنف نے اعجاز کے ذریعے تعلیمی ادارے سے لے کر حکومتی اداروں تک، سب کی سیاست اور معاشرتی مقام کا احاطہ کیا ہے، اعجاز ذات کا اعوان ہے اور معاشرے میں اس کی حیثیت متوسط طبقے سے لے کر اعلیٰ متوسط طبقے تک استوار ہوتی ہے۔ اعجاز ایک سیدھا سادہ اسکول ماسٹر ہے اور اسی اسکول میں اس سے پندرہ سال چھوٹا بھائی سرفراز بھی زیرِ تعلیم ہے۔ اعجاز کی زندگی اچانک پن (Happening) سے عبارت ہے وہ کسی بھی صورتحال کا انتخاب خود نہیں کرتا بلکہ ہر بار صورتحال اس کا انتخاب کر لیتی ہے اپنے رویوں کو مثبت رکھتے ہوئے زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارتا ہے اس کے ہر طرح کے حالات میں اس کی بیوی سکینہ اس کا بھرپور ساتھ نبھاتی ہے۔ اعجاز اور سرفراز کا باپ یعقوب اعوان ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ وہ سرحد کی دوسری طرف اپنی اراضی چھوڑ کر آیا تھا جس کا خیال یعقوب کے ذہن میں تھا۔

"میری ساڑھے بارہ کلے زمین ہے۔" یعقوب اعوان نے کہا۔

"اوئے بے عقلے" ہے کہاں؟ وہ تو ادھر رہ گئی۔ اب واپس جانے آنے کی بات چھوڑ

ادھر بے انت زمین خالی پڑی ہے لوگ اُٹھ اُٹھ کر قبضہ کر رہے ہیں اب تو اپنی قوم میں

آ گیا ہے۔ ادھر اوانوں میں اتفاق ہے۔ تین گھرانے متفق ہیں، تو بھی آ کر ساتھ مل جا

رائے بشن داس کے دس مربعے خالی پڑے ہیں۔ ڈھائی ڈھائی ہر ایک کے حصے آ جائیں

گے" ۔"محکمے والوں کو کیا جواب دیں گے؟ اعجاز نے پوچھا

"فلک شیر واں مہاجرین کے محکمے میں ڈپٹی کمشنر لگا ہوا ہے۔" علی بہادر نے تشریح کی،

"نور پور کے اوانوں کو اس نے مہاجرین کے امرودوں کا باغ الاٹ کرا کے دیا ہے۔

کاغذ واغذ سب اپنے پاس سے بنا کر دیتے ہیں۔ برادری کا آدمی ہے، ہل نہیں سکتا۔(۱۳)

تقسیم کے اوائل ہی میں پاکستان میں نیا متوسط اور نو دولتیہ طبقہ پیدا ہوا جس کی عکاسی اس ناول میں عبداللہ حسین نے کی ہے، پاکستان کے اس نئے معاشرے میں دو چیزوں کا تیزی سے اضافہ ہوا، ملوں اور مزدوروں کا ساتھ ہی اشراف کا نیا طبقہ بھی تخلیق ہوا۔ یہ اعلیٰ طبقہ ان افراد پر مشتمل تھا جنھوں نے اپنی زمینوں کے ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کارخانے اور ملیں بنالیں تھیں۔ اسی طرح طبقات کی تقسیم کا یہ سلسلہ پہلے زمانوں کی طرح چلتا رہا۔ عبداللہ حسین نے اس نئے معاشرے کے موجود آقا و غلام کو بھٹہ کارخانوں اور بھٹہ مزدوروں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان بھٹوں کا اپنا کلچر اور اپنی سیاست تھی بھٹوں پر کام کرنے والے مزدور مرد، عورت وار بچے یا بوڑھوں میں تقسیم نہ تھے بلکہ ان کا شمار محض افراد میں ہوتا تھا کہ فلاں گھر سے اتنے ہاتھ کام کرنے والے ہیں۔ جن کی انتہائی

قلیل اجرتیں تھیں۔ جو زندگی میں سانس کی ڈوری کو جوڑے رکھتی تھی اس کے علاوہ یہ طبقہ ہر ضرورت سے بالاتر تصور کیا جاتا تھا۔ کنیز اس طبقے کا نمائندہ کردار ہے۔

"ایک کچے گھروندے کے سامنے سے لوگوں کو ہٹاتے
ہوئے جب وہ دروازے تک پہنچے۔۔۔۔ دو تنومند آدمی ایک کالے کلوٹے، سوکھے
سڑے آدمی کو مار رہے تھے۔) "(۱۴)

اعجاز کے لیے یہ منظر تکلیف دہ تھا۔ سکول میں مظلوم طبقے (جن میں بھٹہ مزدور بھی شامل ہیں) کے حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی یونین میں اعجاز کی شمولیت ایسا جرم ثابت ہوتی ہے جس کی پاداش میں اس سے زبردستی استعفی لے لیا گیا تھا۔ بھٹہ کلچر میں کام کرنے والے ہاتھ خریدے جاتے ہیں۔ ان میں ایک فرد کی کمی دو ہاتھوں کی کمی تھی۔ لہذا مالک یہ برداشت نہیں نہیں کر سکتا دو ہاتھ کم ہو جائیں، لہذا جب اُس عورت سے اپنے بچے کو سکول بھیجنے کی غلطی کی تو بھٹہ مالک نے اپنے آدمی بھیج کر اُس کے آدمی کو پٹوایا اور وہ خود کو اس معاملے میں حق بجانب سمجھتے ہیں۔ کنیز کا کردار اس طبقے میں بغاوت کی علامت بن کر اُبھرتا ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کنیز ان لوگوں کا نمائندہ کردار ہے جنھوں نے اپنے حق کو پہچان لیا۔ مزدروں اور مزارعوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھنے والے یہ جاگیر دار اور بھٹہ مالک اپنے ہر ناروا سلوک کو جائز سمجھتے ہیں۔ مزدور اور مزارعوں کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی وہ اسی طرح رہن رکھے جاتے ہیں جیسے اشیا کو رہن رکھا جاتا ہے ایسی صورت میں کسی کا بھٹے سے بھاگ جانا (جیسا کہ کنیز نے کیا) گوارا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس طرح خوف کی فضا جو ان لوگوں نے قائم کی ہوتی ہے اس میں فرق آجاتا ہے جو اچھی رسم نہیں۔ کیونکہ اس سے لوگوں کے حوصلے بلند ہوتے ہیں، عبداللہ حسین نے بھٹہ مالک کی نفسیات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

دیہات کے ماحول میں لوگوں کی پہچان ان کے پیشوں سے ہے۔ چھوٹے بڑے رتبے ان کے مقام و مرتبے کا تعین کرتے ہیں۔ پاکستان کے جاگیر داروں کا عمومی رویہ اس ناول میں وہی دکھایا گیا ہے جو متحدہ ہندوستان کے جاگیر داروں کا پشتوں سے چلا آرہا تھا۔ خاص طور پر جاگیر داروں کا نچلے طبقے، اپنے مزارعوں یا اپنے بھٹوں پر کام کرنے والوں کی عورتوں کے لیے ان کی نظر ہمیشہ سے حریص رہی ہے۔ جاگیر دار پڑھ لکھ بھی جائیں ان کی جاگیر درانہ ذہنیت نہیں بدلتی اور عورت کے معاملے میں وہ ہمیشہ بد فطرت ہی رہتے ہیں جیسا کہ کرنل کا کردار ہے۔ پڑھ لکھ کر شہر میں رہتے ہوئے اپنے مزارعے کی بیٹی نسرین کو زبردستی رکھا ہوا ہے۔

"کرنل نے کیا کیا؟" "تمہاری اس سے رشتہ داری نہیں ہے؟ "
۔۔۔۔ ہم ان لوگوں کے مزارعے ہیں۔ یہ میرے ماں باپ گھر کے اندر
بھی نہیں آسکتے۔ (۱۵)

جاگیر داروں کے اس دوہرے رویے کو عبداللہ حسین نے بڑے اچھے طریقے سے پیش کیا ہے طبقات کی ہر سطح پر تفریق اور مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ یہ واضح ہے کہ بہت سی تفصیلات و موضوعات کو ایک یکجا کر دیا گیا ہے۔ کسی ایک موضوع کی واضع شکل نہیں بنتی۔ پاکستان کے دیہات میں طبقات کی جاگیر، عام زمیندار، سرمایہ دار، بڑے کاروبار والا،

چھوٹے آڑھت والے، مزدوراور مزارعے اور سب سے بڑھ کر برادری نظام کی تخصیص کو پیش کر کے عبداللہ حسین نے اپنے طبقاتی شعور کا اظہار کیا ہے۔ جو کہ ایک اچھی اور کارآمد کوشش ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ حسین، اُداس نسلیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴ء، ص۔ ۳

۲۔ ایضاً، ص۔ ۳۵

۳۔ ایضاً، ص۔ ۳۵

۴۔ محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد ۲۰۱۵ء، ص: ۱۹۸

۵۔ عبداللہ حسین، اُداس نسلیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴ء، ص: ۲۰۴

۶۔ ایضاً، ص: ۱۵۱

۷۔ ایضاً، ص: ۱۲۶

۸۔ ایضاً، ص: ۲۲۷

۹۔ عبداللہ حسین، قید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۱

۱۰۔ ایضاً، ص: ۲۶

۱۱۔ ایضاً، ص: ۵۳

۱۲۔ خالد اشرف، برصغیر میں اُردو ناول، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۴۶

۱۳۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸، ص: ۱۱۲۔۱۱۳

۱۴۔ ایضاً، ص: ۱۴۰۔۱۴۱

۱۵۔ عبداللہ حسین، اُداس نسلیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴ء، ص: ۱۵۵